مولانا محمد حنیف ندوی

اسلام کا تصوّرِ ثقافت

(۳)

ربوبیتِ کبریٰ یا وحدتِ انسانیت

دوسری اہم بات جو اسلام کے تصورِ ثقافت کو نکھار بخشتی ہے، توحید اور ربوبیتِ کبریٰ کی اجتماعی تعبیر ہے۔ قرآن حکیم کی تعلیمات انسان اور انسان کے درمیان خون، نسل، رنگ، زبان، یا تاریخ و جغرافیہ کی ان تفریقات کو تسلیم نہیں کرتا۔ جو معاشرہ کو اعلیٰ و ادنیٰ کے دو گروہوں میں بانٹ دے۔ جب خدا ایک ہے کائنات ایک ہے اور اس میں کار فرما طبعی عوامل بھی وحدت اور یکسانی لیے ہوئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انسانیت ایک نہ ہو۔ قرآن اس بارہ میں دو ٹوک اور واضح نقطۂ نگاہ کا حامل و داعی ہے۔ اس کے نزدیک تمام انسان، ایک ہی اصل اور ایک ہی سرچشمۂ فیض کا ثمرہ و نتیجہ ہیں:۔

هو الذی خلقکم من نفس واحدة (اعراف: ۱۸۹) — وہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا۔

خلقکم من نفس واحدة (زمر: ۶) — اس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا۔

یہی نہیں۔ شرف انسانیت میں سب برابر کے شریک ہیں۔

ولقد کرمنا بنی آدم (اسراء: ۷۰) — اور ہم نے بنی آدم کو تکریم و اعزاز سے بہرہ مند کیا۔

سب احسن تقویم۔ یا اخلاق و روحانیت کے بہترین سانچوں میں ڈھلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (تین: ۴) — بلاشبہ ہم نے انسان کو بہت عمدہ صورت پر پیدا کیا۔

قرآن حکیم کے نزدیک کسی شخص کا مقام اس سے متعین نہیں ہوتا کہ اس کی رگوں میں کس قوم یا قبیلہ کا خون دوڑ رہا ہے۔ اس کا رنگ سرخ اور سفید ہے یا کالا اور سیاہ۔ اس کے پاس دولت و ثروت کے انبار

ہیں - یا یہ تہی دست اور تہی داماں ہے - اس کے نزدیک عزت و تکریم کا معیار تقویٰ ہے - اخلاقی و روحانی برتری ہے - وہ اقدار ہیں جن سے سیرت و کردار کے گوشے سنورتے ہیں - یا عام فہم الفاظ میں وہ معنوی خوبیاں ہیں جن سے معاشرہ نکھرتا، آگے بڑھتا، اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا استحقاق پیدا کرتا ہے -

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم - تم میں زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ متقی ہے -

(حجرات : ۱۲)

ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب و ادیان نے وحدتِ انسانیت کے بلند تر اصول کی تبلیغ نہیں کی - ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام کسی دین یا تہذیب و تمدن کی تعبیر میں ایسے اصولوں اور اداروں کی طرح نہیں ڈالی ہے جو اخوت اور بھائی چارہ کے جذبوں کی یہ کہہ کر پرورش کر سکے کہ چھوٹے چھوٹے اختلافات کے باوجود تمھارے لیے "کلمۂ سواء" کی گنجائش موجود ہے - جو نفرت و بغض کے اسباب کا قلع قمع کر سکے - جو پوری انسانیت کو ایک سلک میں پرو سکے، اور انسانوں میں رنگ، نسل اور قومیت کی تنگ نظرانہ عصبیتوں سے ہٹ کر اس ہمہ گیر احساس شرف کو بیدار کر سکے کہ سب انسانوں کا خمیر ایک ہی مٹی سے اٹھا ہے - یہی وجہ ہے اسلام جہاں بھی گیا رنگ و نسل کی دیواریں نہ صرف خود بخود گرتی چلی گئیں - اور عزت و جاہ کے مصنوعی فاصلے آپ سے آپ سمٹتے چلے گئے - بلکہ ہر ہر شخص کے دل میں ایک نئی زندگی کا احساس پیدا ہونے لگا، نئی روح پرافشاں ہونے لگی اور نفرت و تحقیر میں گھری ہوئی دنیا میں برابری اور مساوات کی نئی بستیاں آباد ہوتی چلی گئیں - اسلام کے نظام عمل میں وحدتِ انسانیت کا نظریہ فلسفیانہ تجرید کا حامل نہیں، بلکہ یہ ایک زندہ اور فعال تاریخی حقیقت ہے - فلنٹ (FLINT) نے بجا طور پر کہا ہے کہ جہاں عیسائیت نے اس نظریہ کو صرف ادب و تحریر کی زینت قرار دیا وہاں اسلام نے ایسے اداروں کی داغ بیل ڈالی، اور اس طرح اور عملی طریقے اختیار کیے کہ جن سے یہ تصور، شاعری کی حدود سے نکل کر معاشرہ کی روزمرہ زندگی میں داخل ہوا اور اس کا فردی جزو ترکیبی بن گیا۔[۱]

وحدتِ انسانیت سے ہماری مراد صرف یہ ہے کہ تمام انسان شرف انسانیت سے یکساں طور پر

---

[۱] ہسٹری آف فلاسفی آف ہسٹری ان اسلام ص ۱۳۳ - ۱۳۴ بحوالہ اسلامک کلچر مصنفہ ڈاکٹر محمد یوسف ص ۲۹

بہرہ مند ہوتے ہیں۔ اس لیے رنگ، نسل یا قومیت کا کوئی دائرہ فی نفسہٖ بہتر یا ادنیٰ نہیں ہے۔ عقیدہ، عمل اور سیرت کی تابندگی اصل معیار یا کسوٹی ہے اور اس کی روشنی میں کسی فرد یا معاشرہ میں خیر اور بہتر کا تعین ممکن ہے۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ، ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ (زلزال : ۸)

سو جو ذرہ بھر بھلائی کرے وہ اس کا ثمرہ پائے گا۔ اور جو ذرہ بھر برائی کا مرتکب ہو اس کو بھی اس کی سزا بھگتنا پڑے گی۔

وحدتِ انسانیت کے سلسلہ میں ایک اہم سوال یہ ابھر کر فکر و نظر کے سامنے آتا ہے کہ کیا اسلام مختلف قومیتوں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا اور کیا ہر ہر قوم و ملک میں ان تہذیبی خصوصیات کو ماننے سے انکار کرتا ہے جو تاریخ کے ناگزیر عملیہ سے معرضِ ظہور میں آتی ہیں۔ کیا وحدتِ انسانیت کا یہ مطلب ہے کہ نہ صرف سب کی زبان ایک ہو، سب کی پوشاک یکساں ہو، بلکہ رسم و رواج کے معاملہ میں بھی سب مسلمان ایک ہی اسلوبِ زیست کو اپنائیں اور اپنی مقامی و علاقائی مخصوصیات تہذیبی سے بہرحال دست بردار ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں اختصار کے ساتھ یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے وحدتِ انسانیت کے پہلو بہ پہلو تہذیب و تمدن کی اس بوقلمونی اور رنگارنگی کو ماننے سے کبھی انکار نہیں کیا جو ہر ہر قوم کا طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ مختلف قبائل و شعوب کے وجود اور فرق کو قرآن نے واضح الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔

وجعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا (الحجرات : ۱۳)

اور ہم نے تمھیں مختلف شاخوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو جانو اور پہچانو۔

اختلافِ زبان کو بھی اللہ تعالیٰ نے نشان یا آیت ٹھہرایا ہے۔

ومن ایاتہٖ خلق السمٰوات والارض واختلاف السنتکم و الوانکم (روم: ۲۲)

اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بات ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ اسی طرح تمھاری رنگتوں اور زبانوں کے اختلاف ہیں۔

اور اس چیز کا بھی قرآن اعتراف کرتا ہے کہ مختلف قوموں نے عہدِ ماضی میں فکر و عمل کے مختلف تہذیبی اداروں کو اپنایا ہے۔

لکل جعلنا منکم شرعۃً ومنھاجًا ۔ اور ہم نے تم سب کے لیے ایک شریعت اور راہ کی تعیین کی ۔ (مائدہ : ۴۸)

اسلام ایک متعین دین ہے، جانا بوجھا ایک نظریۂ حیات ہے، عقائد و عبادات اور معاملات میں اس کی ہدایات واضح اور روشن ہیں ۔ یہ تہذیب و ثقافت کے ایسے تصورات کی پرورش کرتا ہے جنھیں ایک طرف ان تمام اقدار کی جھلک ہو جو ہمہ گیر انسانیت پر مبنی ہیں اور دوسری طرف قومی و وطنی خصوصیات کو اس میں اس طرح سمو دیا گیا ہو کہ ان دونوں میں دوئی یا اختلاف باقی نہ رہے ۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے ان دونوں کی حیثیت ایسے دستہ گل کی ہے جو ایک طرح کی اصولی وحدت کے باوجود اپنی آغوش میں نکہت و رنگ کی جزئی خصوصیات لیے ہوئے ہے ۔

اس تاریخی حقیقت کو کون نہیں جانتا کہ اسلام کے پرچم تلے دنیا کی جس قدر قومیں جمع ہوئی ہیں، ماضی میں قبولیت و پذیرائی کی اس شاندار روایت کی کہیں نظیر نہیں ملتی لیکن اس کے باوجود کسی جگہ بھی اسلام نے مختلف قوموں کی ان خصوصیات کو اپنانے میں بخل سے کام نہیں لیا جن میں افادیت کا کوئی بھی پہلو پایا جاتا تھا، یا جن میں حسن و فن کی کوئی بھی خوبی تھی ۔ مصر میں قبطیوں، مغرب اقصیٰ میں اقوام بربر، ایران میں عجمیوں اور ہندوستان میں رہنے والوں نے کیا جب اسلام کو اپنی نجات و کامرانی کا ذریعہ مانا، تو اپنے تہذیبی وجدان سے دستکش ہو کر نہیں بلکہ اسلامی تہذیب میں ایک نیا رنگ بھر کر ۔ اور اس کے اصولی روپ میں اپنی مخصوص تابناکیوں کو اجاگر کر کے لیکن جزو غالب کی حیثیت سے ان میں ہمیشہ اسلام ہی کی چھاپ نمایاں رہی ۔ یعنی مصری، ایرانی، مغربی اور ہندوستانی کے حدود فرق و امتیاز نے ان میں اجنبیت اور منافرت پیدا نہیں ہونے دی ۔ یہی وجہ ہے مختلف تہذیبی خصوصیات سے بہرہ مند ہونے کے باوصف ہر جگہ یہ مسلمان کی حیثیت سے صاف پہچانے گئے ۔

اسلام کی تاریخ شاہد ہے زبان کے اختلاف، لباس کی رنگا رنگی اور رسوم کی انفرادیت نے کبھی بھی ان میں بیر اور دشمنی کے بیج نہیں بوئے ۔ یہی نہیں اس اختلاف نے ہر جگہ اسلامی تہذیب کو اور نکھارا اور جاذب نظر بنایا ہے ۔ جس طرح کوئی بھی ثقافت دوسرے تہذیبی ورثوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتی، اور اس میں کچھ لو اور دو، کا تاریخی عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے ۔ ٹھیک اسی طرح کوئی بھی زبان جو ثقافت ہی کا ایک حصہ اور پہلو ہے مکمل نہیں، بنابریں دوسری زبانوں سے علیحدہ اور الگ تھلگ رہ کر ترقی نہیں کر سکتی ۔

ہر زبان اپنی بقا اور ترقی کے لیے اس بات کی متقاضی ہے کہ اس میں ہمہ گیر انسانی قدروں پر زور دیا گیا ہو۔ اس میں معنوی گہرائیاں اور لطائف ہوں، اس میں تہذیب و تمدن کی ترکتازیوں کو سمونے کی صلاحیت ہو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں ذوق و فن اور حسن و جمال کی جلوہ گری ہی نہیں تخلیق و اختراع کے معجزات پائے جائیں۔

زبانوں میں تنگ نظری، تعصب اور بیر کا زہر گھولنے والی کسی بھی زبان کی اپنی فطرت یا مزاج نہیں۔ کچھ سیاسی، اقتصادی اور تاریخی عوامل ہیں جو ان میں اختلاف اور دشمنی کی دیواریں چن دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں انسان انسان کا دشمن اور ایک قوم دوسری قوم کی حریف بن جاتی ہے اور جب یہ دیواریں گرتی ہیں تو اس کے ساتھ زبان کے اثرات میں بھی ردّ و بدل کا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ غور فرمائیے، وہی عربی جس نے زمانہ جاہلیت میں عربوں میں کبر و پندار کے جذبے کو اس حد تک ابھارا کہ اس کے مقابلہ میں تمام غیر عرب، عجم یا گونگے قرار پائے، جب اسلام کی ترجمان بنی تو اخوت، مساوات پیار اور محبت کے ہمہ گیر انسانی رشتوں کی نگراں اور محافظ ٹھہری۔ اور جب حالات نے کچھ اس طرح پلٹا کھایا کہ عربی قومیت کے ساتھ سیاسی و اقتصادی مصلحتیں وابستہ سمجھی گئیں تو اسی عربی کے خلاف، جو پورے عالم اسلام کے تہذیبی اور ثقافتی خزائن کو بانٹنے والی تھی شعوبیت کی مخالفانہ لہر اٹھی۔ اور آخر آخر میں یہ عقیدہ و فکر کے ساحلوں سے جا ٹکرائی۔

وہ فارسی اور پہلوی زبان جو مجوسیت کی آغوش میں پلی اور بڑھی تھی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اسلامی ادب، اسلامی تاریخ، اور اسلامی تصوف کی نقیب و داعی کی حیثیت سے ابھری۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس صف میں جا کھڑی ہوئی جہاں عربی کھڑی تھی۔

دُور کیوں جائیے اس سانولی سلونی اردو کی حیثیت ابتدا میں اس کے سوا اور کیا تھی کہ انگریز نے فارسی کے مقابلہ میں اس کی سرپرستی کی لیکن پھر یہی اردو اس ٹھاٹھ سے پروان چڑھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورے اسلامی ہند میں اس کا طوطی بولنے لگا اور یہ بلا شرکت غیرے اسلامی تہذیب و ثقافت کی نمائندہ قرار پائی اور اس لائق ہو گئی کہ مغرب کی گوری زبانوں سے آنکھیں لڑا سکے۔ اس کے ارتقا کا آغاز اس وقت ہوا جب غالب نے اس میں حکمت و فلسفہ کے موتی بکھیرے۔ میر اور مومن نے اس میں سوز، درد اور اخلاص کا رنگ بھرا۔ جب سرسید نے اس کو تکلف و قافیہ کی بھول بھلیوں سے نکالا اور سادگی اور

سلاست سے مالا مال کیا۔ جب شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے، اسے علوم و فنون کی نادرہ کاریوں سے نوازا، اسے تصنیفی اسلوب میں ڈھالا، اور جب اقبال نے اسے اپنے فلسفیانہ افکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ غرض یہ ہے کہ کوئی بھی زبان اپنے مزاج اور فطرت کے اعتبار سے ایسی نہیں ہے کہ ترقی نہ کر سکے اور ہمہ گیر انسانی، روحانی اور علمی قدروں سے قطع نظر کر کے پروان چڑھ سکے۔

غرض قرآن حکیم جہاں اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ ہماری تہذیب ربوبیت کبریٰ کے تقاضوں کو لیے ہوئے آگے بڑھے اور ایسا علمی، اخلاقی اور روحانی قدروں کی پرورش کی ضامن بنے، جو رنگ و نسل کے اختلافات کو مٹا دے۔ وہاں ابلاغ، تعلیم اور تربیت کے نقطۂ نظر سے ہر ہر قوم اور معاشرہ کے اس حق کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنی زبان کا احترام کریں، اس کو ترقی دیں۔ اور اسے مافی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ ٹھہرائیں۔ انبیا علیہم السلام سے بڑھ کر کون یہ چاہے گا کہ تہذیب و ثقافت کی ہمہ گیر صداقتوں کو پھیلائے، وحدتِ فکر اور ہم آہنگی پیدا کرے اور اپنے اصولوں کی تبلیغ و اشاعت میں سرگرم عمل ہو۔ جن سے فاصلے سمٹیں۔ نفرت اور بیر کے داعیے دُور ہوں اور تمام انسانیت عبودیت اور بندگی کے استوار رشتوں میں منسلک نظر آئے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے ہر ہر قوم اور معاشرہ میں اسی زبان کو منتخب کیا جو اُن میں رائج اور مقبول تھی۔ جس کا خمیر ان کی اپنی آب و ہوا سے اٹھا تھا جس میں وہ سوچتے، متاثر ہوتے اور اظہارِ خیال کرتے تھے:

وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه لیبین لهم (ابراہیم: ۴) — اور ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم ہی کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ اللہ کے پیغام کو کھول کر بیان کرے۔

لباس کے معاملے میں بھی اسلام اسی اصول کا حامی ہے کہ اس میں جہاں اُن پاکیزہ انسانی اقدار کا خیال رکھا جائے، جو ساری انسانیت کے لیے مفید اور آیۂ رحمت ہیں وہاں تنوع، رنگا رنگی اور ان خصوصیات کو بھی گوارا کیا جائے جن کو کسی قوم یا معاشرہ نے اپنا رکھا ہے۔

قرآن حکیم اس حقیقت کا کھلے بندوں اظہار کرتا ہے کہ آب و ہوا، موسم اور پیشے کی تبدیلیوں سے لباس کی وضع قطع میں تبدیلیوں کا ہونا ناگزیر ہے۔

وجعل لکم سرابیل تقیکم الحر وسرابیل تقیکم باسکم (نحل: ۸۱) — اور تمھارے لیے کچھ پہناوے دیے گئے کہ تمھیں گرمی سے بچائیں اور کچھ پہناوے بنائے کہ لڑائی میں تمھاری حفاظت کریں۔

قرآن حکیم ذوقِ جمال کی رنگا رنگی بھی تسلیم کرتا ہے اور واضح الفاظ میں اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ لباس میں زینت و آرائش کے پہلو موجود ہیں۔ اور یہ کہ زینت و آرائش کے یہ پہلو قطعی ممنوع نہیں۔

خذوا زینتکم عند کل مسجد (اعراف ۳۱) اپنی زینت کا اہتمام کرو جب مسجد میں جاؤ۔

قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ۔ (اعراف: ۳۲) کہہ دیجیے کس نے حرام قرار دی وہ زینت جو اس نے بندوں کے لیے اجاگر کی۔

یہی نہیں قرآن حکیم یہ چاہتا ہے کہ ہر شخص اپنا رہن سہن اس انداز کا رکھے کہ جس سے تحدیثِ نعمت کا اظہار ہو اور یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کسی شخص یا معاشرہ کو سہولت و آسائش کی کن کن صورتوں سے نواز رکھا ہے۔

واما بنعمۃ ربک فحدث (ضحیٰ: ۱۱) اور اپنے رب کی نعمت کا چرچا کر۔

حدیث میں اس آیت کی تشریح ان الفاظ میں آئی ہے:

ان اللہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہ (ترمذی) اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کے بندوں پر اس کے انعامات کا اظہار ہو۔

تنوع اور اختلاف کی ان صورتوں کو جو آب و ہوا اور ذوق و ضرورت کے تقاضوں سے ابھرتی ہیں، اسلام نظر انداز نہیں کرتا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ ان میں پاکیزہ اور بلند تر انسانی اقدار کو بھی ملحوظ و مرعی رکھا جائے، جو تہذیبِ اسلامی میں ہمہ گیر وحدت اور یکسانی پیدا کر سکے اور ان کو ایک مخصوص ملّت اور مخصوص گروہ کے سانچے میں ڈھال سکے۔ (باقی آئندہ)

اسلام کا معاشی نظریہ : از محمد مظہر الدین صدیقی

عہدِ جدید کے معاشی مسائل پر اسلام کے ان بنیادی اور دائمی اصولوں کا اطلاق جن پر عہدِ رسالت کے تفصیلی اور فروعی احکام مبنی تھے۔ صفحات: ۱۰۹، قیمت: ۱/۷۵ روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور